جدید فقہی مطالعات میں منہجی بحران

ایک تاریخی و تجزیاتی خاکہ

ڈاکٹر محمد کمال امام

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	جدید فقہی مطالعات میں منہجی بحران ایک تاریخی وتجزیاتی خاکہ
مصنف	:	ڈاکٹر محمد کمال امام
صفحات	:	۴۰
قیمت	:	۳۰/روپے
سن طباعت	:	فروری ۲۰۱۲ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز

۱۶۱-ایف بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ای میل: ifapublication@gmail.com

فون: 011 - 26981327

مجلس ادارت

۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی
۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
۳- مولانا بدر الحسن قاسمی
۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۵- مولانا عتیق احمد بستوی
٦- مولانا عبید اللہ اسعدی

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

تمہید	۷
بحران کی نوعیت - ایک عمومی جائزہ	۸
نفاذ شریعت کی منسوخی - تاریخی جائزہ	۸
اسلامی فقہ کی میدان زندگی سے دوری	۱۲
بحران کو ختم کرنے کی کوششیں	۱۸
اجتہاد کے دروازہ کو کھولنا	۱۸
اجتہاد کے رہنما خطوط	۲۰
جامعہ ازہر کا حلقہ	۲۲
عام دانشور طبقہ	۲۳
بین الاقوامی علمی حلقہ	۲۴
اجتہاد کے میدان	۲۵
الٹا اجتہاد	۲۸
اسلامی احکام کی قانونی سازی	۳۰
ماضی میں قانون سازی کی کوششیں	۳۲
قانون سازی کا طریقہ کار	۳۶

تمہید

آج جب مسلمان اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں، وہ ایک ایسے بحران میں مبتلا ہیں جس کی تین شاخیں ہیں:

(۱) فکری بحران (۲) سماجی بحران (۳) نظامی بحران

(۱) فکری بحران کا اصل سبب یہ ہے کہ منہج اور طریق کار واضح طور پر معین نہیں ہے۔

(۲) سماجی بحران کی بنیاد یہ ہے کہ اسلامی شریعت کا نفاذ باقی نہیں رہا۔

(۳) نظامی بحران کی بنیاد یہ ہے کہ شریعت اسلامی (امت کے تغافل کی وجہ سے) اپنے منصب ومقام سے دور ہے۔

جس بحران کی تینوں شاخیں دراصل سارے عالم اسلامی پر چھائی ہوئی تہذیبی آزمائش کے مختلف پہلو ہیں، یہ معاشرتی وتہذیبی بحران ایسا ہمہ گیر ہے کہ اس کے رفع کرنے کے لئے زبردست اور پرہمت کوششوں اور ایک عمومی بیداری کی لہر کی ضرورت ہے، جو پورے عالم اسلام کو جھنجھوڑ دے، اور مسلمانوں کو ہر سطح پر سرگرم عمل کردے، حتی کہ ہر گوشہ میں ایک خالص اسلامی فکری وتہذیبی ماحول تیار ہو، اور اس بحران کا خاتمہ کیا جاسکے۔

ہماری اس تحریر کا موضوع صرف فکری بلکہ اس میں بھی صرف فقہی بحران ہے، لیکن عمداً ہم نے پہلے مذکورہ تینوں پہلوؤں کا ایک عمومی جائزہ پیش کیا ہے، اس لئے کہ یہ تینوں بحران دراصل ایک ہی حقیقت کی مختلف شکلیں اور اس کے مختلف مظاہر ہیں، ان میں آپس میں ایسا تعلق ہے کہ کسی ایک پہلو کو اس کے عمومی ڈھانچہ سے الگ کرکے دیکھنا بہت سی غلط فہمیوں کا باعث ہوسکتا ہے۔

ہم نے بحران کے شکار فقہی افکار کے تاریخی جائزہ میں مصر کو نمونہ کے طور پر رکھا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ مصر کے افکار واحوال سے ہماری واقفیت زیادہ گہری اور وسیع تر

ہے- بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مصر کی اس پوری تاریخ میں ازہر یونیورسٹی کا ایک مرکزی اور فعال کردار ہے، اور ازہر سارے عالم اسلامی کا بڑی حد تک نمائندہ ادارہ ہے، اس لئے اس تاریخی مطالعہ کا موضوع مصر کو بنانا دوسرے ممالک کے اختیار کرنے سے زیادہ بہتر معلوم ہوا، لیکن اس کے باوجود میں نے اس کی کوشش کی ہے کہ دوران تحریر دوسرے ممالک کے قابلِ ذکر حالات اور فکری انقلابات کا بھی تذکرہ کیا جاتا رہے۔

بحران کی نوعیت - ایک عمومی جائزہ:

اسلامی فقہ کا اصل امتیاز اور اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ اخلاقی اور قانونی بنیادوں پر مبنی ایسے نظام کے پیش کرنے پر قادر ہے جو ہر زمانہ کے تغیر پذیر حالات کا ساتھ دے سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حق قائم ونافذ ہو اور اس کو برتر حاکمیت کا مرتبہ ملے، وہ حالات کے سامنے سپر انداز ہونے کی روش قطعاً اختیار نہیں کرتا۔

فقہ کی اس صلاحیت میں کسی کمی آنے سے ذہن وفکر پر زنگ لگنے لگتی ہے، اور احکام فقہ جامد ومعطل ہوجاتے ہیں، اور تجدید واصلاح اور جمود وتعطل کی آپسی کشمکش شروع ہوتی ہے جس میں اگر جمود غالب آتا ہے تو فکری صلاحیتیں جدید حالات کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہوجاتی ہیں، یہی ہمارے زیر بحث بحران کی نوعیت ہے۔

فقہ اسلامی پر اپنی پوری طویل تاریخ میں گذشتہ دوصدیوں جیسا بحرانی دور نہیں آیا، اس بحران کے دو بنیادی عناصر تھے:

۱- اسلامی شریعت کا نفاذ ختم ہوگیا۔

۲- اسلامی فقہ زندگی سے دور ہوگئی۔

نفاذ شریعت کی منسوخی - تاریخی جائزہ:

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلامی شریعت کا نفاذ اس لئے ختم کیا گیا تاکہ

زیادہ بہتر نظام قضاء قائم ہو اور قانونی انتشار ورجعیت کا خاتمہ ہو۔ یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اسلامی شریعت کی معطلی اس حملہ آور تہذیب کی طے شدہ پالیسی تھی جو عالم اسلام کے اکثر علاقوں پر چھا گئی تھی۔ یہ دوررس عواقب ونتائج کی حامل تبدیلی اس وقت کی گئی جب سلطنت عثمانیہ مغرب کے شکنجہ میں پورے طور پر کسی جا چکی تھی، اور علاقائی طاقتیں ابھر رہی تھیں، سخت استبدادی ڈکٹیٹر شپ میں غیر ملکی اقتدار کے غیر معمولی دباؤ کے تحت اسلامی قوانین کی منسوخی کا اقدام کیا گیا۔

مغربی ممالک کے استعمار کو پختہ و ناقابل شکست بنانے کے لئے متبادل یورپین قانون کا نفاذ ضروری معلوم ہوا، اس لئے کہ استعمار کی سب سے بڑی طاقت (بلکہ سب سے بڑی کامیابی بھی) فکری غلامی ہی تھی۔ اور ایک ایسا اسلامی قانون جو روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہو فکری غلامی کے پیدا ہونے کے امکانات کو بڑی حد تک کم کرتا ہے۔ لہذا اسلامی قانون کی منسوخی مغربی استعمار کی ایک ناگزیر ضرورت تھی۔

شریعت کے نفاذ کے خاتمہ سے ہی فوجی استعمار کے لئے سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر اثر انداز ہونے کا راستہ ہموار ہوگیا، اور فقہ بھی ایک ایسے بحران کا شکار ہوگئی جس میں اس سے حاکمیت اور رہنمائی کا منصب چھین لیا گیا۔ مصر میں پہلے ۱۸۷۶ء میں مخلوط عدالتیں قائم کی گئیں، اور پھر ۱۸۸۳ء میں سول عدالتوں کا قیام عمل میں آیا، جدید فرانسیسی قوانین سارے شعبوں میں نافذ کئے گئے، عائلی قوانین (اور اس کے متعلقات وراثت وقف وغیرہ) کے سوا سارے شعبوں سے اسلامی شریعت بے دخل کردی گئی، اور اس کے لئے مثبت منفی ذرائع سے راہ ہموار کی گئی۔

۱- اس سلسلہ میں ان مستشرقین نے بڑی خدمت انجام دی جنہوں نے اسلامی شریعت کو قدامت پسند اور زمانہ سے غیر موافق قانون ثابت کرنے کی کوشش کی، اور اس کو ایک غیر پختہ اور جامد نظام باور کرایا۔

۲- ایک اور طریقۂ کار یہ اپنایا گیا کہ نپولین کے فرانسیسی قانون کا عربی ترجمہ کرایا گیا، اسی کے ساتھ فلسفہ قانون کی کتابوں کی بھی اشاعت کی گئی، اس سلسلہ میں بنتام کی کتاب ''اصول الشرائع'' اور مونٹیکو کی کتاب ''روح القوانین'' کی عربی میں اشاعت کی گئی۔

مذکورہ بالا دونوں طریقوں سے رائے عامہ کو اسلامی شریعت کے خلاف انقلاب کے لئے تیار کیا گیا، اور یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ جدید فرانسیسی قانون ہی واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعہ قوم زمانہ کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتی ہے۔ اسی کے ذریعہ معاشرہ فکری تعطل وتقلید سے آزاد ہوکر ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

بعض حضرات نے موجودہ فقہی انحطاط کو فقہاء کے جمود اور ان کے غیر ضروری روایت پسند رویہ کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک فقہاء نے جدید اسلوب کے مطابق فقہ کی قانون سازی نہ کرکے خود اس انقلاب کا راستہ ہموار کیا ہے۔ علامہ رشید رضا، رفاعہ پاشا سے روایت کرتے ہیں کہ شاہ اسماعیل نے رفاعہ طہطاوی سے یہ درخواست کی کہ وہ شیخ الازہر اور دیگر علماء کے پاس جائیں اور ان کو فقہ اسلامی کی اصلاح وتجدید پر آمادہ کریں، اور ان کو دعوت دیں کہ وہ نئے زمانے کی زندگی کے لئے ایک نظام تو تشکیل کریں، شاہ اسماعیل نے شیخ طہطاوی سے یہ بھی کہا کہ آپ کے لئے یہ کام نسبۃً آسان ہے، اس لئے کہ آپ کا تعلق بھی طبقہ علماء سے ہے، لہٰذا آپ انہیں اچھی طرح مطمئن کرسکتے ہیں۔ آپ کو یہ بتادیں کہ یوروپ کا مستقل دباؤ مجھ پر پڑ رہا ہے کہ پے در پے ہونے والی نئی تبدیلیوں کے تقاضوں کے مطابق اگر فقہ کی اصلاح نہیں ہوئی تو مصر پر فرانسیسی قانون نافذ کردیا جائے گا۔

شیخ طہطاوی نے اس کے جواب میں کہا کہ میں اب اپنی عمر کے آخری ایام میں ہوں۔ اب تک کسی نے میرے دین پر طعنہ زنی نہیں کی، اب آپ مجھے ایسے کام کا مکلف نہ بنائیں جس سے میں مشائخ ازہر کی طرف سے تکفیر کے حملوں کا نشانہ بنایا جاؤں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے اس سے سبکدوش ہی رکھیں۔

اس پورے سوال وجواب پر شیخ عبدالمتعال الصعیدی اپنی کتاب "المتجددون فی الاسلام" میں یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ "ازہر کی جانب سے یہ مایوس کن رویہ ہی سول عدالتوں کے قیام کا سبب بنا جن میں نپولین کا قانون نافذ ہوا"۔ اس کے نتیجہ میں ہی فقہ اسلامی پر یہ مصیبت نازل ہوئی، اس کی ذمہ داری سے مشائخ وعلماء ازہر کسی طرح بری نہیں ہوسکتے"۔

اسلامی شریعت کی منسوخی کے لئے یورپ کی طرف سے جو دباؤ ڈالا گیا، وہ اس روایت سے پوری طرح عیاں ہے، مگر روایت کے بعض اجزاءنظر ثانی کے محتاج ہیں، چنانچہ فرانسیسی قوانین کے نفاذ کا اصل ذمہ دار فقہاء ہی کو قرار دے دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ خود حکومت نے بھی اس کا تہیہ کر رکھا تھا، اس سلسلہ میں اس کے کردار کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، علماء کے ساتھ حکومت کا تعلق بس اس قدر تھا کہ اس کے ذریعہ سول نافرمانی کے خطرے سے بچا جاسکے، اورعوام میں ان کی مقبولیت کا فائدہ اٹھا کر رائے عامہ اپنے حق میں کی جاسکے۔

اس سے پہلے محمد علی پاشا نے اسکندریہ کے مفتی شیخ جزائری کو یکساں اسلامی سول کوڈ تیار کرنے پر مامور کیا تھا۔ اور ممکن ہے انہوں نے تیار بھی کر لیا ہو، لیکن محمد علی پاشا نے مکمل اغماض برتا اور اس پر توجہ ہی نہیں دی۔

بلکہ اس کام کے لئے شیخ جزائری کا انتخاب ہی اس کا پتہ دیتا ہے کہ حکومت سرکاری کاموں کے لئے کس طرح کے علماء کا انتخاب کرتی تھی۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے محمد علی پاشا نے شیخ جزائری سے یہ استفادہ کیا تھا کہ کیا حکومت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ سد ذریعہ کے طور پر مملوکہ زمینوں کے وقف کو ممنوع قرار دے دے۔ اس لئے کہ ایک بڑی تعداد اس کو کسی شرعی وارث کو محروم کرنے یا دین کی ادائیگی سے بچنے کے لئے ایک آسان حیلہ کے طور پر استعمال کرنے لگی ہے۔

شیخ جزائری نے اس کے جواب میں وقف کے بارے میں ائمہ کا اختلاف نقل کرنے کے بعد سد ذریعہ کے طور پر اس کے جواز کا فتویٰ دیا، اور اس کو شرعی مصالح کا تقاضہ قرار دیا۔

اسماعیل پاشا اور توفیق پاشا کے عہد میں فقہ کی قانون سازی کی متعدد کوششیں کی گئیں

اور عام طور سے غیر ممالک فرانس وغیرہ کے قوانین کو اختیار کرنے کی مذمت کی گئی ،قدری پاشا (جو نپولین کے قانون کے ایک مترجم ہیں) نے نپولین کے قانون کے انداز پر ایک فقہی مجموعہ تیار کرنے کا ارادہ کیا، اور کسی فقیہ نے ان کے اس طریقہ کار پر تنقید نہیں کی، مگر اس طرح کی کوششوں سے کیا ہوتا جب کہ حکومت نے ہی عوام پر فرانس کی قانونی غلامی مسلط کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

قانونی غلامی کے نتیجہ میں کئی طرح کی غلامی مسلط ہوئیں، فقہی غلامی کی شکل یہ ہوئی کہ نپولین کے قانون کی تشریح کے لئے فرانسیسی قانون کی موسوعات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ،عدالتی غلامی اس طرح مسلط ہوئی کہ قانون کی تشریح کے لئے فرانس کے عدالتی نظائر سے مدد لینی پڑتی۔

جیسا کہ آگے ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ اس طریقہ سے ملک کے سربرآوردہ اور چیدہ ومنتخب تعلیم یافتہ طبقہ کا ذہن وفکر ٹھیٹھ غیر اسلامی ہوتا گیا، معاشرہ کی اقدار بدل گئیں، اور اسلام اور جدید ذہن وفکر کے درمیان گہری کھائیاں حائل ہوگئیں۔ اسلامی قانون کے بجائے غیر اسلامی لادینی قانون نے معاملات کی ایسی قسمیں اور ایسے عادات واعراف کو جنم دیا جو اسلامی شریعت سے بالکل متضاد تھے۔ اور بقول طارق بشری فقہ کے سامنے اب دو ہی راستے تھے: ایک تو یہ کہ وہ اس غیر اسلامی صورت کے سامنے سپر انداز ہوجائے چاہے اس صورت میں شرعی اصول ومبادی کتنے ہی پامال ہو رہے ہوں۔ یا معاشرہ سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو کر اپنے سر جمود وتعطل کا الزام لے لے۔

اسلامی فقہ کی میدان زندگی سے دوری:

اس نئی صورتِ حال نے جو عالم اسلام پر مسلط کر دی گئی تھی ،فقہ اسلامی کی تحریک پر درج ذیل تفصیلات کے مطابق منفی اثرات چھوڑے،فقہ اسلامی کا منہج اور فقہی کاوشیں دونوں ان منفی اثرات سے متاثر ہوئے۔

الف- فقہ کا موضوع اور فقہاء کی کاوشوں اور صلاحیتوں کا مصرف فقہی متون کی شرح

وتعلیم قرار پایا اور حالات اور نئی تبدیلیوں سے وہ دور ہوتے گئے۔

چنانچہ شیخ احمد ابراہیم مصر کے لاء کالج LAW COLLEGE میں جو لکچر زدیتے تھے وہ بس مجلۃ الاحکام العدلیہ کی مختصر تشریح اور ان پر تعلیقات پر مشتمل ہوتے تھے۔

اس صورتِ حال کا اندازہ کرنے کے لئے بس ایک اقتباس کافی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فقہاء کا اصل مطمح نظر بس منقول فقہی سرمایہ کی حفاظت تھی۔ شیخ ابوالفتح نے اپنی کتاب ''احکام المعاملات فی الشریعۃ الاسلامیۃ'' میں احکام شریعت بیان کرنے کے ساتھ ملکی سول قانون کے ساتھ اس کا موازنہ بھی کیا، اس کتاب کی تالیف کا مقصد مصنف نے یہ بیان کیا ہے کہ ''اسلامی احکام ذہنوں میں تازہ رہیں اور زوال وفنا کے عوامل احکام شریعت پر اثر انداز نہ ہوجائیں''۔

آزمائشی دور میں بھی فقہاء نے اپنی تحقیقات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں کیا کہ مختلف فقہی مذاہب کو ان میں جگہ مل سکے، اس دور کی فقہی کاوشیں مکمل طور پر ایک مسلک کے تابع رہیں، خاص طور پر ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' کے اثر سے حنفی مسلک ذہن وفکر پر چھایا رہا، عام طور پر اس دور کی فقہی تصنیفات کا موضوع مجلّہ ہی کی تشریح وتوضیح رہا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مصر کے پرسنل لاء میں حنفی فقہ ہی کا اعتبار کیا تھا۔ اور عدالتوں میں پرسنل لاء ہی بس اسلامی تھا۔ باقی سارے شعبے لادینی قانون کے تابع تھے۔ پرسنل لاء کے بارے میں قانون سازی فقہ ہی کے دائرے میں ہوتی تھی۔ قانون جس معاملہ میں خاموش ہو اس کے بارے میں قاضی فقہ حنفی ہی کی کسی رائے کو بنیاد بنا کر فیصلہ کرتا تھا۔ لہذا فقہ حنفی ہی دلچسپی کا مرکز بنا رہا۔

ب- اس صورتِ حال میں جب کہ غیر اسلامی قانون نافذ وحاکم تھا، فقہاء ہر زیر بحث مسئلہ میں قدیم فقہاء کے اقوام نقل کردینے پر اکتفا کرتے تھے، اور اگر خود کچھ دخل دیا تو یہ کہ عبارت یا مضمون کی کچھ تفصیل کردی، اس دور کا جو فقہی سرمایہ ہمارے سامنے ہے، اس کا اکثر حصہ اسلامی قانون پر عمل آوری کے لئے نہیں بلکہ قانون اسلامی کی یاددہانی کے لئے لکھا گیا، کیونکہ قانون کے بیشتر میدانوں میں غیر اسلامی قانون نافذ کئے جاچکے تھے، اس دور کا تقریباً پورا فقہی

سرمایہ ایک فقہی مذہب کی نقول پر مشتمل ہے۔ یہ نقول فقہ اسلامی کی شادابی وزرخیزی سے عاری ہیں، ان فقہی کاوشوں میں اپنے زمانہ کی نت نئی تبدیلیوں کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

ج - باوجود اس کے کہ اسلامی قانون میں قاضی کا عہدہ بڑا موثر عہدہ ہے، پھر بھی پرسنل لاء میں اسلامی قانون کے نفاذ سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا، نہ معیار میں ترقی آئی اور نہ اجتہاد کا سلسلہ از سر نو جاری ہو سکا۔ بقول علامہ عبدالرزاق سنہوری: قاضی کا کام بس اس قدر ہے کہ وہ منقول احکام کی تطبیق کر دیا کرے، اس کے اپنے ذہن وفکر کا کہیں کوئی دخل نہیں شرعی قاضی مقلد ہوتا ہے مجتہد نہیں، وہ اس کا پابند ہے کہ وہ (چند مسائل کو چھوڑ کر جن کا ذکر قانون کی دفعات میں کر دیا گیا ہے) باقی تمام مسائل میں صرف فقہ حنفی کے مطابق فیصلہ کیا کرے۔ یعنی وہ مقلد بھی بس ایک متعین مذہب کا اور اس کے بھی راجح قول کا ہوتا ہے، اس کے ذہن وفکر پر مذہب کی قید سخت ہوتی ہے۔ لہذا اگر شرعی قضاء کے نظام سے فقہی بیداری نہیں ہو سکی اور فقہ جدید تمدن کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکی تو یہ باعث تعجب نہیں۔

بلکہ اگر آپ غور کریں تو شرعی قضاء کے نفاذ سے قانونی سطح پر یکجہتی اور یک رنگی کا فقدان ہی نظر آئے گا۔ اس لئے کہ شہری قانون کا بعض حصہ (پرسنل لاء) تو اسلامی شریعت سے ماخوذ تھا، اور بڑا حصہ غیر ملکی قوانین کے تابع تھا جو مکمل طور پر غیر اسلامی ہیں۔

ایک طرف وضعی قانون سازی اپنے وسیع تر دائرہ نفاذ اور حاکمیت کی وجہ سے، نیز دوسروں کے نتائج فکر سے استفادہ کی وجہ سے مستقل ترقی کرتی رہی، اس کی رفتار لگاتار تیز ہوتی رہی اور دوسری طرف شریعت اسلامیہ کو زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے بے دخل کر دینے کی وجہ سے اس کے سامنے ترقی کی ساری راہیں مسدود ہو گئیں اور جمود طاری ہو گیا۔

ازہر کا ادارہ اس سلسلہ میں اچھا کردار ادا کر سکتا تھا، اور اچھی خدمات پیش کر سکتا تھا، مگر پوری ۱۹ ویں صدی کے دوران اس کی ساری توجہات کا مرکز سیاسی معرکہ آرائی، اور عوامی انقلابات رہے۔ اس لئے ازہر سے نسبت رکھنے والے فقہی حلقہ نے بھی اس دوران جدید تعمیری

کام کرنے کے بجائے قدیم فقہی سرمایہ کی حفاظت پر ہی قناعت کی، تجدید واصلاح کی تحریک ازہر کے مخالفین یا کم از کم غیر متعلق حضرات کی جانب سے ہی اٹھی، جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد محمد عبدہ کی دعوت سے ہی یہ جمود ٹوٹا اور ازہر اس راہ پر ان کے شاگردوں کے ذریعہ ہی آسکا جو ازہر کے بنیادی مناصب پر فائز ہو گئے تھے۔

لیکن اس دور میں بھی عام طور پر مصر کے فقہاء مصر کے جدید قانونی صورتِ حال سے بہت متفکر رہے۔ شیخ محمد عبدہ نے ۱۹۰۴ء کے فوجداری قانون کو مسترد کر کے اسلام مخالف قوانین کے بارے میں واضح موقف اختیار کیا، پھر انہوں نے تمام مذاہب سے ماخوذ یکساں سول قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔

ہمارے نزدیک ان کا یہ طرزِ فکر فقہ کے بحرانی دور کو ختم کرنے کے لئے بہت مناسب تھا۔

بہت سے لوگوں نے شیخ محمد عبدہ کی موافقت کی، شیخ علی ابو الفتوح نے اپنی کتاب ''الفواطر الشریعیۃ'' میں غیر ملکی قانون کی درآمد اور پھر اس کے نفاذ کی خطرناکی سے خبردار کرانے کی کوشش کی، ساتھ ہی اسلامی شریعت کی خصوصیات وامتیازات اس کی وسعت وکشادگی اور صلاحیت بقاء کو تفصیل سے بیان کیا۔

فرانسیسی قوانین کے ۲۰ سال نافذ رہنے کے بعد لوگوں کو پریشانی اور تنگی کے پیشِ نظر ان میں اصلاح اور ترمیم کی ضرورت محسوس کی گئی، اس وقت موقع تھا کہ ان قوانین کی کمزوریاں واضح کی جاتیں، اور ان پر زبردست تنقیدی حملے کر کے یہ ثابت کر دیا جاتا کہ وہ حقیقت سے دور اور لوگوں کے مسائل کے حل کرنے میں قطعی ناکام ہیں۔ اس کے پہلو بہ پہلو ایک مثبت خدمت یہ انجام دی جاسکتی تھی کہ اسلامی شریعت کی خوبیوں اور کمالات سے عوام کو واقف کرایا جاتا، اور دونوں قوانین کا موازنہ ومقابلہ کر کے یہ ثابت کیا جاتا کہ اسلامی قانون فرانسیسی قانون سے کہیں بالاتر اور انسان کی فلاح وسعادت کا ضامن ہے اور معاصر فقہی سرمایہ کو قانون سازی کے سلسلے میں ایسے اسلامی نظریات سے مالا مال کر دیا جاتا جو جدید قانونی نظریات کا مقابلہ کرتے بلکہ ان پر

فوقیت لے جاتے۔

لیکن یہ کام اس پیمانہ پر نہیں ہوسکا، جس سے حالات میں کوئی انقلابی تبدیلی رونما ہونے کی امید کی جاتی، اس وقت پھر شیخ محمد عبدہ کی اس رائے کی قدر معلوم ہوئی کہ ازہر کی تجدید اور قضاءشرعی کے نظام میں اصلاح کی شدید ضرورت ہے، اسی زمانے میں عرابی پاشا کی انقلابی تحریک ناکامی سے دوچار ہوئی تھی، اس لئے یہ بات بالکل فطری تھی کہ اس فقہی بیداری کے ساتھ آزادی کی تحریک بھی زور پکڑتی۔

فقہ اسلامی کی افادیت اور برتری ثابت کرنے کے لئے اس وقت ایک سازگار ماحول تھا لیکن اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا، مذکورہ سبب کے علاوہ اس کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ جو طبقہ فقہی ذہن کی جدید بیداری سے خائف تھا۔ اور اس بیداری کو اپنے مفادات کے حصول میں رکاوٹ سمجھتا تھا اس نے علماء وفقہاء کو اصل معرکہ سے غافل رکھنے کی کوشش کی اور مرکزی پوائنٹ پر محنت کرنے کے بجائے چند جانبی موضوعات میں الجھائے رکھا اور اس کے لئے انتہائی منصوبہ بند طریقہ کار اور بہترین حکمت عملی تیار کی گئی۔

مثلاً اس وقت عورت کی آزادی جیسے حساس اور نازک مسئلہ کو چھیڑا گیا۔ سب سے پہلے ایک بڑے وکیل مرقص فہمی نے اپنی کتاب ''المرأۃ فی الشرق'' شائع کی، کتاب کا علمی معیار تو کچھ تھا نہیں، البتہ اس سے اس کا ضرور اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا مصنف بڑا قادر الکلام ہے اور نثری شاعری کر کے جذبات کو اپیل کرنے میں خصوصی مہارت رکھتا ہے، اس کے بعد دیگر بہت سے مصنفین نے اپنی کتابیں شائع کیں، شروع میں قاسم امین، اور زین الدین کی کتابیں شائع ہوئیں اور ۲۰ ویں صدی کے درمیان میں اسماعیل مظہر اور حال ہی میں نوال سعداوی کی کتابیں آئیں۔

ہماری رائے یہ ہے کہ اس دور میں علماء کی قیمتی صلاحیتوں اور ان کے اوقات کا صحیح مصرف یہ جزوی مسائل نہیں تھے۔ ان میں الجھ کر وہ اپنی جنگ کے اصل محاذ سے ہی غافل

ہو بیٹھے، لیکن ان گرم اور زور دار معرکہ آرائیوں کے ساتھ ساتھ مستشرقین اور حکومت کے اسلام کے ساتھ معاندانہ رویہ کے اثر سے فقہاء میں گرمی اور دینی غیرت وحمیت پیدا ہوئی، اور ان باطل خیالات کی زبردست تردید کی۔ شیخ محمد عبدہ اور شیخ عبدالعزیز جاویش وغیرہ بھی اس معرکہ میں سرگرم رہے۔

یہ علمی اور فقہی جنگ جاری ہی تھی کہ بعض مغرب زدہ بلکہ مغرب کی فکری غلامی کے شکار نام نہاد دانشوروں نے دینی روایات ونصوص پر بے جا تنقیدیں کر کے سستی شہرت کمانی چاہی، اس سنت سیئہ کی ابتداء طہ حسین کی کتاب "**الشعر الجاهلي**" اور علی عبد الرزاق کی کتاب "**الاسلام و أصول الحكم**" سے ہوئی۔

ان نام نہاد اہل دانش کی کاوشوں کی علمی حیثیت تو بڑی کمزور تھی، لیکن اس سے لوگوں کی حمیت دینی میں گویا ابال آ گیا اور علماء اس گمراہ کن فتنہ کے مقابلہ کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ مصطفیٰ صبری اور مصطفیٰ الغلاینی نے اپنی تحریروں میں عورت کی مکمل آزادی اور بے پردگی کی زبردست مخالفت کی، نیز محمد الخضر حسین، محمد عرفہ، نجیب المطیعی، غمراوی، فرید وجدی، وغیرہ نے طہ حسین کی کتاب "الشعر الجاہلی" کی اپنی کتابوں میں تردید کی اور شرعی نصوص کے سلسلہ میں صحیح طرز فکر کو واضح کیا۔ اسی طرح نجیب المطیعی، محمد الخضر حسین اور طاہر بن عاشور نے "اصول الحکم فی الاسلام" کے جواب لکھے، ان کے بعد اسی منہج اور انداز میں شریعت اور اسلامی قانون کے متعلق کثیر تعداد میں کتابیں سامنے آئیں اور مصری یونیورسٹی اور ازہر میں کثیر تعداد میں محققین نے اسی انداز میں مطالعہ اور غور وفکر کرنا شروع کیا۔ بلکہ تین بنیادی اداروں (عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ) کے کردار، اختیارات فرائض اور حدود کو خصوصی ریسرچ اور بحث وتحقیق کا موضوع بنایا گیا۔ اور مدرسہ القضاء الشرعی کے نصاب میں ان کا معتد بہ حصہ رکھا گیا۔ مثال کے طور پر شیخ محمد البناء کے وہ محاضرات کافی ہیں جو موجودہ صدی کی چوتھی دہائی میں اسی مدرسہ میں دیئے گئے تھے۔

ان معاضرات میں عمومی طور پر شرعی نظام سیاست وجہانبانی پر روشنی ڈالی گئی تھی اور مذکورہ تینوں اداروں پر خصوصی زور دیا گیا تھا۔

بحران کو ختم کرنے کی کوششیں:

گذشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ تحریر کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ صورت حال کی پورے طور پر تصویر کشی ہوجائے اور جس بحران سے اس وقت فقہ اسلامی گذر رہی ہے اس کا تجزیاتی خاکہ تیار ہوجائے اور اس کی پوری وضاحت ہوجائے، بہت سی رکاوٹوں کے باوجود بحران کی نوعیت خود طریقہ اصلاح کے خدوخال متعین کر رہی ہے۔

اس بحران کے دو پہلو تھے: ۱-عملی، ۲-علمی۔

عملی پہلو تو یہ تھا کہ شریعت کو حاکمیت سے علیحدہ کردیا گیا تھا اور علمی پہلو یہ تھا کہ فقہ اسلامی زندگی اور حیویت سے دور ہوگئی تھی، اس لئے ضروری تھا کہ بحران کو ختم کرنے کی کوششیں عملی اور نظری دونوں سطح پر ہوں، اس کے لئے دو کاموں کی ضرورت تھی، ایک یہ کہ اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جائے، دوسرے یہ کہ متعین منہج کے تحت احکام شریعت کی قانون سازی کی جائے۔

۱-اجتہاد کے دروازہ کو کھولنا:

الف- اجتہاد کی ضرورت:

چوتھی صدی کے بعد مسلمانوں پر عجیب قسم کا دماغی اور عقلی تعطل چھا گیا جس کے نتیجہ میں وہ فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئے، فقہاء کے یہاں فرضی مسائل کی بہت کثرت ہوگئی جس نے بعد کے زمانہ میں پریشان کن چیستانی رنگ اختیار کرلیا، ابن فرحون کے یہاں اس کا خوب اندازہ ہوسکتا ہے لیکن ان ادوار میں معاشرہ میں اسلامی شریعت کے نفاذ ورواج کی وجہ سے دو چیزیں رونما ہوئیں:

۱- پہلی چیز یہ کہ یہ عقلی جمود فقہی اعتبار سے انتہائی درخشندہ وتاباں دور کے بعد آیا۔ اس دور میں فقہی مذہب مدون ہو چکے تھے، اور ان کے قواعد اور اسالیب فکر کی تحدید وتعیین بھی ہو چکی تھی، اسی کے نتیجہ میں بعد کے فقہاء کے لئے یہ ممکن ہوسکا کہ وہ بیان شدہ مسائل فروع کی بڑی تعداد سے ہی اپنے زمانہ کے مسائل ومشاکل کا جواب دے سکیں، اور ان کے فقہی حل پیش کرسکیں اور بدلتے ہوئے حالات میں فقہی نمائندگی کا کام انجام دے سکیں۔

ان حضرات نے اگر چہ کسی مذہب کی داغ بیل تو نہیں ڈالی اور ان کا دائرہ کار اپنے تقلیدی مسالک کے اندر ہی محدود رہا، مگر انہوں نے استنباط اور اختیار وترجیح کی اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعہ اپنے زمانہ کے لئے جو مسائل بیان کئے وہ اس کی ضرورت کے لئے کافی بلکہ یقیناً زائد ہی رہے، اس لئے مسلمانوں کو کبھی بھی اپنے فقہی سرمائے میں تنگی محسوس نہیں ہوئی، اور وہ زندگی کے کارواں سے پیچھے نہیں رہے، جیسا کہ بدقسمتی سے گذشتہ دوصدی میں ہوا۔

۲- دوسری چیز یہ ہے کہ فی الواقع عملی طور پر اجتہاد بالکل ختم اور اس کی رفتار بالکل رک نہیں گئی تھی بلکہ کبار فقہاء اور ان لوگوں نے جو صدیوں کے مجدد شمار کئے جاتے ہیں اجتہاد کے راستہ کے مسدود ہونے اور اس سلسلہ کے ختم ہوجانے کا صاف انکار کیا۔ امام شاطبی اس کی علت یہ بتاتے ہیں: اجتہاد کا قاعدہ قرآن وسنت سے ثابت ہے، اسی لئے اسے بروئے کار لانا اور ترک نہ کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح علامہ عز الدین بن عبد السلام نے بھی اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے متعلق اقوال وروایات کی تردید کی، اور ان کو "بے دلیل باتیں جن کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری" کہا ہے، امام شوکانی نے بھی ان باتوں پر اپنے تعجب اور حیرت کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے، "زمانہ کا مجتہدین سے خالی ہونے کی رائے بڑی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے اس لئے کہ اگر اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ نے گذشتہ صدیوں کے علماء کو جس فہم وفراست اور جس درجہ کی ذہنی وعقلی صلاحیتوں سے نوازا تھا، اب ان کو اٹھالیا ہے۔ تو یہ ایک بے دلیل دعویٰ اور بے بنیاد بات ہوگی

اور اگر اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ متقدمین کو جو ذرائع علم واجتہاد میسر تھے، اب وہ میسر نہیں ہیں۔ تو یہ بات تو بدیہی طور پر غلط اور خلاف واقعہ ہے، اس لئے کہ علم واجتہاد کے وسائل آج جتنے میسر ہیں پہلے کبھی نہیں تھے۔ اور قرآن وسنت اور مذاہب ومسالک میں تدبر کرنا آج آسان ہے پہلے کبھی نہیں تھا''۔

امام شوکانی نے جو بات لکھی ہے وہ ہمارے اس زمانہ پر زیادہ منطبق ہوتی ہے، کیونکہ ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ کمپیوٹر کا ایک بٹن دبا کر ہر مسئلہ کے بارے میں پورے فقہی سرمایہ سے واقف ہوجائیں۔

اگر اجتہاد کا سلسلہ اب بھی شروع ہوسکتا ہے اور اس کی راہیں کلیۃ مسدود نہیں ہوتی ہیں، تو ہمارے زمانہ کو تو اجتہاد کی اور زیادہ ضرورت ہے، اور زیادہ بڑے پیمانے پر ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اب حالات بدل گئے ہیں، شب وروز نت نئے مسائل پیدا ہورہے ہیں اور معاملات کی ایسی صورتیں پیدا ہورہی ہیں جن کی کوئی نظیر نہیں ملتی، ان حالات میں فقہاء کے سامنے دو ہی راستے ہیں: ایک تو یہ کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ کے مسائل کے لئے ایسے حل پیش کریں جن میں شریعت اسلامی اور لوگوں کے مصالح کی بجا طور پر رعایت کی گئی ہو اور دونوں کو اپنا حق دیا گیا ہو اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ زندگی سے کنارہ کش ہوکر بیٹھے رہیں اور زندگی کی قیادت ورہنمائی کی اپنی اس ذمہ داری سے دستبردار ہوجائیں جو ان کے اوپر اللہ کے ابدی دین میں ڈالی گئی ہے۔

ب- اجتہاد کے رہنما خطوط:

فقہ کی نشأۃ جدیدہ (تشکیل نو) کے داعیوں کے یہاں اجتہاد کی دعوت مشترک نقطہ تھی۔ لیکن اجتہاد کا طریقۂ کار اور اس کے بنیادی خطوط واضح نہیں ہوسکے تھے۔ شیخ محمد عبدہ نے اس سلسلہ میں ایک پیش رفت یہ کی کہ انہوں نے کسی ایک مسلک کے دائرہ میں محدود نہ رہ کر مذاہب اربعہ سے خوشہ چینی کئے جانے کی تجویز رکھی، لیکن اس سلسلہ میں سب سے اہم کارنامہ شیخ

محمد مصطفیٰ مراغی نے انجام دیا، انہوں نے فقہی احکام کی قانون سازی اور فقہ کی تجدید کے لئے ایک زیادہ واضح لائحہ عمل متعین کیا، آپ اس کا خلاصہ اور روح درج ذیل نکات میں بیان کرسکتے ہیں:

۱- اسلامی شریعت میں اجتہاد صرف علماء کا کام ہے عام مسلمانوں کو اس سلسلہ میں ان کی اتباع ہی کرنی چاہئے اور اس میدان کو ان کے حوالہ کردینا چاہئے اور اجتہاد کرنے والے علماء کو شرائط اجتہاد کا حامل ہونا چاہئے۔

۲- شرعی اجتہاد اس زمانہ میں عقلاً وعادۃً ممکن ہے۔

۳- جن فقہی احکام کا دارومدار غیر قطعی الدلالہ یا غیر قطعی الثبوت دلائل پر ہو ان میں اختلاف کی بنیاد پر تکفیر وتفسیق کی گنجائش اور جواز نہیں، اس سلسلہ میں بہت احتیاط برتنی چاہئے۔

۴- ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال وآراء کو پورے وثوق کے ساتھ ان کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

۵- اجتہادی احکام میں عرف عام اور عرف خاص کی بنیاد پر تبدیلی ہوسکتی ہے، اور نصوص سے مستنبط احکام کی تخصیص عرف عام کی بنیاد پر بالاتفاق ہوسکتی ہے۔ اور بعض فقہاء احناف کی رائے کے مطابق ان احکام میں عرف خاص کی بنیاد پر بھی تخصیص ہوسکتی ہے۔

شیخ مراغی کے بیان کردہ اجتہادی لائحہ عمل کے یہ بنیادی نکات تھے، یہ نکات شریعت کی قانون سازی کی مستقبل کی کوششوں کے لئے رہنما ثابت ہوسکتے تھے لیکن عام طور پر فقہاء نے اس لائحہ عمل کو قبول نہیں کیا، خاص طور پر یہ تجویز کہ قانون سازی کے لئے تمام ہی مذاہب سے استفادہ کیا جائے، فقہاء کے لئے بڑی بے چینی کا باعث ہوئی، انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔

۱۹۱۵ء میں جب نکاح وطلاق کے احکام کی قانون سازی کا بل تیار کیا گیا اور اس کے تیار کرنے والوں نے کسی ایک مسلک کی پابندی نہیں کی بلکہ مذاہب اربعہ سے مساوی طور پر استفادہ کیا، اس وقت بھی اس بل کی زبردست مخالفت کی گئی، حالانکہ یہ طریقہ لوگوں کے مصالح

کے اعتبار سے زیادہ بہتر تھا۔ اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس منصوبہ پر عمل درآمد نہیں ہوسکا، اور یہ بل پاس نہیں ہوا۔

لیکن اس کے بعد جو قوانین وضع ہوئے ان میں ناگزیر ضرورت ہونے کی بنا پر بہر حال اسی طریقۂ کار کو اپنا کر تمام ہی فقہی مذاہب سے استفادہ کیا گیا، چار معروف فقہی مذاہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کی کتابوں سے بھی بعض اقوال اختیار کئے گئے۔ اور بنیادی نظریہ کے طور پر یہ بات تسلیم کی گئی کہ تمام مذاہب میں مساوی طور پر صحت کا امکان ہے۔ شیخ مراغی کے علمی مقام کی وجہ سے اس نظریہ کی علمی حلقوں میں بہت بازگشت رہی، اور خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ ایک سے زائد مرتبہ شیخ الازہر رہے تھے، ہم اس نظریہ کی صدائے بازگشت کو تین خانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

اول: جامعہ ازہر کا حلقہ:

''شیخ الازہر'' کے عہدہ پر فائز ہونے کے زمانہ میں شیخ مراغی نے جامعہ ازہر کے نصاب ونظام تعلیم میں بڑی دوررس اہم تبدیلیاں کیں اور خاص طور پر دراسات علیا (HIGHER EDUCATION) کے شعبوں میں مفید اصلاحات کیں۔ ان اصلاحات کے نتیجہ میں اصول فقہ اور فقہ اسلامی کے موضوعات پر ایم، اے اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں کی صورت میں بڑی گراں قدر کتابیں وجود میں آئیں، ان کتابوں نے آئندہ زمانہ کے طریقۂ تالیف وتصنیف پر گہرا اثر ڈالا۔ مثلاً شیخ محمد مصطفیٰ شبلی کا تحقیقی مقالہ "تعليل الأحكام" اور شیخ عبد الغنی عبد الخالق کا رسالہ ''حجية السنة'' اور احمد فہمی ابو سنہ کی کتاب "العرف والعادة في رأى الفقهاء" (یہ تینوں رسائل اصول فقہ کے موضوع پر ہیں) اور شیخ شوکت عدوی کا رسالہ "نظريه العقد" اور شیخ ابراہیم عبد الحمید کا رسالہ "العلاقات الدولية في الاسلام" اور شیخ عبد الرحمان تاج کا رسالہ ''السياسة الشرعية'' یہ رسالہ فقہ کے فروعی موضوعات پر ہیں جو اسلام کے سول قانون، قانون بین الممالک اور دستوری قوانین کو حاوی ہیں۔ ان فقہاء کی کوششوں کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ

ازہر میں اور ازہر کے باہر لاء کالجز دارالعلوم قاہرہ میں ایک فقہی سرگرمی پیدا ہوگئی، بلکہ عالم اسلام کی موجودہ فقہی تحریک میں ان فقہاء کا بڑا اثر ہے اور جو عمومی فقہی بیداری دیکھی جارہی ہے وہ ان ہی حضرات کی رہین منت ہے۔

ان حضرات کا بلند علمی مقام ومرتبہ اپنی جگہ مسلم ہے، مگر یہ بات بھی صحیح ہے کہ ان کی کوششوں سے ایسی پائیدار فقہی لہر وجود میں نہ آسکی جس کے واضح خطوط اور متعین اصول وبنیادیں ہوں اور اس بیداری کی لہر کی نگہداشت کرنے والے اور اسے صحیح رخ دینے والے مردان کار ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری کوششیں بغیر منصوبہ بند لائحہ عمل کے مکرر ہوتی گئیں۔ اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ فروع ومسائل پر تصنیفات کے ڈھیر لگ گئے اور ایک ہی موضوع پر کی گئی تصانیف ہوگئیں لیکن مقصد حاصل نہیں ہوسکا۔ گویا کمیت QUANTITY کے اعتبار سے تو اس ذخیرہ میں کافی اضافہ ہوا لیکن کیفیت QUALITY کے اعتبار سے کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔

دوم: عام دانشور طبقہ:

عصری تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس فقہی کشمکش سے الگ نہیں رہ سکا، حالانکہ ایک مخصوص حلقہ کی جانب سے اس کی مستقل کوشش کی جاتی رہی کہ یہ طبقہ اس میدان میں ہونے والی اہم ترین اور دوررس نتائج کی حامل کشمکش سے الگ اور بے تعلق رہے۔ چنانچہ اس حلقہ کے بعض افراد نے بھی اپنی حمیت ایمانی کی بنیاد پر اسلامی شریعت کی تازہ دمی، ابدیت اور اس کی تر وتازگی کو ثابت کرنے اور اس پر ہونے والے بے بنیاد حملوں کا دفاع کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی عمر لطفی کا مقالہ "الدعوی الجنائیة فی الشریعة الإسلامیة" ہے جو انہوں نے فرانسیسی زبان میں ۱۹ ویں صدی کے آخر میں تحریر کیا ہے۔ اسی طرح مدرسۃ الحقوق LAW COLLEGE کے بعض طلبہ نے اسلام اور شریعت اسلامی سے اپنی جذباتی وابستگی اور حمیت کا ثبوت دیتے ہوئے اور قانون کے تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں لامیر

کے اسکول سے متاثر ہوکر بعض تحقیقی مقالہ لکھے جس میں اسلامی شریعت کے قانونی سرمایہ کی طرف نشاندہی کی گئی تھی اور اس بیش بہاخزانہ کوعیاں کیا گیا تھا۔ ان میں محمود فتحی کا تحقیقی مقالہ "التعسف فی استعمال الحق فی الفقه الإسلامی" اور محمد صادق محمود کا مبسوط تحقیقی مقالہ "الإثبات فی القانون المدنی المقارن" خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں مؤخر الذکر نے اپنا مقالہ دوجلدوں میں تحریر کیا ہے، اس مقالہ کی پہلی جلد میں انہوں نے فلسفہ قانون پر بحث کی ہے اور واضح کیا کہ یورپ میں اثبات دعوی کے بارے میں جتنے قانونی نظریات اور طریقے ہیں ان کے مقالہ میں اسلام کا اثبات دعوی کا نظریہ اور طریقہ فنی باریکیوں کے اعتبار سے بہت فائق ہیں۔

اس کے علاوہ سنہوری کا "خلافت" کے موضوع پر مقالہ جو انہوں نے ۱۹۲۵ء میں لکھا اور فوادمہنا کا مقالہ "اجتهاد القاضی فی القانون الإنجلیزی والشریعة الإسلامیة" جو ۱۹۳۰ء میں تحریر کیا گیا خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر قانون دانوں نے بھی بہت سے قیمتی اور مفید مقالے تحریر کئے۔

اس سلسلہ میں بیان میں یہ بات کہنا بھی ضروری ہے کہ ان فقہی مقالوں اور تحقیقات کی تیاری اور ان کے مخصوص مزاج کی تشکیل میں شیخ محمد ابراہیم، شیخ محمد ابوزہرہ، شیخ علی خفیف اور شیخ عبدالوہاب خلاف کا بنیادی کردار رہا ہے، یہ حضرات ان مقالوں کی تحریر کے دوران نگرانی بھی فرماتے تھے اور پھر ان کے تیار ہونے کے بعد مناقشہ بھی کرتے تھے، اس کے علاوہ ان کی پرمغز بصیرت اور علمی تحریروں کا بھی ان مقالوں پر کافی اثر پڑا ہے۔

سوم: بین الاقوامی علمی حلقہ:

متعدد اسباب کی بنیاد پر بین الاقوامی حلقوں میں اسلام اور شریعت اسلامیہ سے واقفیت تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ صورت حال قدیم زمانہ ہی سے پائی جاتی رہی، اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اب یہ ختم ہوچکی ہے، لیکن اتنا ضرور ہوا ہے کہ موجودہ صدی کی چوتھی دہائی سے فقہاء

اس میں کامیاب ہو سکے ہیں کہ وہ مغرب کے اعلی قانونی حلقوں کو اسلامی فقہ کی اہمیت اور اس کی خصوصیات سے واقف کرا سکیں، اور اس طرف سے ان کے اطمینان قلب کا سامان فراہم کر سکیں۔

اس مہم کے انجام دینے میں بڑا حصہ چند عالمی کانفرنسوں اور مجالس کا ہے۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں ''لاہای'' میں منعقد ہونے والی قوانین کے تقابلی جائزہ کی بین الاقوامی کانفرنس اور اسی مقصد سے بلائی گئی دوسری کانفرنس جو ۱۹۳۷ء میں منعقد کی گئی، پھر ۱۹۴۸ء میں لاہای ہی میں وکلاء کی بین الاقوامی کانفرنس کی قراردادیں اور اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں پیرس یونیورسٹی کے LAW COLLEGE میں اسلامی فقہ کا ہفتہ منایا گیا، اس کی دعوت انٹرنیشنل اکاڈمی برائے تقابلی مطالعۂ قوانین کے مشرقی قوانین کے شعبہ نے دی تھی۔ ان مجلسوں میں ممتاز قانون دانوں اور سرکردہ علماء وفقہاء شریک ہوئے اور اہم اور نازک موضوعات پر مقالے پیش کئے اور خاص طور پر ان پیچیدہ مسائل کا اسلامی حل پیش کیا جو مغرب کے سامنے انتہائی حیرت واضطراب کا باعث اور مغربی مفکرین کے لئے ایک مستقل سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں، ان مقالوں سے اسلام کے قانونی سرمایہ کی ہمہ گیری اور اس کی واقعیت آشکارا ہوئی اور مغربی مفکرین اور ماہرین قانون انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کے ذہنوں میں اسلامی شریعت کے جمود اور اس کی نئے تقاضوں سے عدم مناسبت کی جو غلط فہمیاں تھیں وہ بڑی حد تک دور ہوئیں اور شریعت کے استقلال وخود کاری اور اس کی تازہ دمی وبالیدگی کا نیا تاثر ان کے قلب ودماغ پر پڑا۔

ج - اجتہاد کے میدان:

فقہ کی اصلاح وتجدید کا اصل میدان تو فروعی مسائل ہی ہیں، لیکن علم اصول فقہ کو بھی اس اصلاح عمل سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اصول فقہ اور فقہ کے درمیان ناقابل تفریق حد تک ربط ہے۔ اصول فقہ ہی فقیہ کے استنباط اور اجتہاد کا آلہ اور رہنما ہے، علم اصول فقہ کی حیثیت ایک پل کی ہے جسے عبور کر کے شریعت متعدد علوم مثلاً: فلسفہ، علم کلام، علم اخلاق، علوم

لغت کی معروضی تعبیر میں حصہ لیتی ہے۔

اصول فقہ کی تجدید اور جدید اسلامی قانون سازی کے لئے اس کو زیادہ مفید بنانے کی کوششوں کا آغاز بظاہر اس وقت ہوا جب شیخ محمد عبدہ نے خاص طور پر ان کتابوں کی طرف توجہ دلائی جو اصلاحی اور تجدیدی رجحان کی حامل تھیں۔ شیخ نے امام شاطبی کی مشہور کتاب "الموافقات" کی اہمیت اجاگر کی، اور ان ہی کی توجہ سے یہ کتاب چھپ سکی، شیخ محمد عبدہ کے بعد ان کے شاگرد شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق نے اصول فقہ کو فلسفہ میں اس اعتبار سے شامل کیا کہ اصول فقہ مسلمانوں کا علم منطق ہے۔

علامہ شیخ محمد طاہر نے اس سلسلہ میں ایک قابل ستائش اجتہادی کام یہ کیا کہ انہوں نے اپنی کتاب "مقاصد الشریعۃ" میں حریت وآزادی کو ایک مستقل مقصد قرار دیا، ان کے اس اضافہ سے بجا طور پر اس فکری کشمکش کے ماحول کا اندازہ ہوتا ہے جو مصنف کے زمانہ میں اپنے عروج پر تھا اور جس کے نتیجہ میں ان کی عقل نے شریعت کے اس مقصد تک رسائی بھی پائی اور اس کی تعیین بھی کی، ان کے نزدیک ایک محدود دائرہ میں منحصر ہوکر صرف ارادہ پر عمل کی آزادی نہیں ہے بلکہ جدید اصطلاح کے مطابق سیاسی وعملی ہر انداز کی آزادی مراد ہے۔

اصول فقہ کی اصولی ومنہجی اصلاح، اس کو ترقی دینے اور جدید علمی معیار کے مطابق کرنے کی کوششیں اپنی انتہا کو سوڈانی فقیہ ڈاکٹر حسن الترابی کے یہاں پہنچ جاتی ہیں، لیکن ان کے یہاں کچھ اس حد تک آزادی آگئی ہے کہ اس کے بعد نتائج کی صحت کا متاثر ہونا کچھ بعید نہیں۔

ڈاکٹر ترابی کے نزدیک اصول فقہ کے قواعد وضوابط قطعی نہیں ہیں بلکہ ان میں پہلے بھی اختلاف رہا ہے اور بالکل ممکن ہے کہ اس میں اب کچھ مزید اختلاف کی گنجائش ہو، اس فن پر اس ماحول کی گہری چھاپ ہے، جس میں اس فن کی داغ بیل رکھی گئی اور اس کا نشوونما ہوا، اسی خاص علمی ماحول اور فضا کا اثر ہے کہ اس فن میں منطقی طرز استدلال اور اس کی اصطلاحات کی بھرمار ہے۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ قواعد کسی طرح بھی قطعی طور پر حرف آخر

نہیں ہیں، ایک خاص مرحلہ پر پہنچنے کے بعد اس فن میں جو جمود پیدا ہوگیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ فن تغیر پذیر زندگی سے ایک بالکل الگ خشک فن بن گیا ہے۔ اور اپنے مقصد کے لحاظ سے بھی یہ فن اپنی افادیت بڑی حد تک چھوڑ چکا ہے، اصول فقہ کے ماہر سے یقینی طور پر یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ فقہ کی تشکیل نو کرے، یا کچھ اجتہاد کر سکے، حالانکہ دور حاضر کی فقہی بیداری کی ضرورتیں اور نیا مادی، سماجی اور تعلیمی ماحول سب اس بات کے متقاضی ہیں کہ اصول فقہ کی تجدید کی جائے اور موجودہ تقاضوں کے مطابق اس کی تشکیل نو کی جائے تا کہ متوقع اجتہادی انقلاب کی تنظیم ہو سکے۔

ڈاکٹر ترابی کا یہ بھی خیال ہے کہ اصول فقہ کے بارآور اور نتیجہ خیز نہ ہونے کی بنیادی وجہ معاصر فقہ اسلامی کا منہجی بحران ہے۔ اس بحران کے خدوخال کی نشاندہی ہم اس طرح کر سکتے ہیں:

۱- یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ منقول فقہی ذخیرہ موجودہ زمانہ کے لئے کافی ہے جب کہ موجودہ حالات اور مسائل میں وہ ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔

۲- ساری علمی وعقلی کوششوں اور توجہات کا مرکز اسلام کی اساسی تعلیمات اور اس کے اصول ہیں، یعنی اس خیال کے حامل طبقے کے نزدیک اسلام میں فقہی بحثوں اور احکام کے سلسلہ کے اجتہادات کی کوئی ضرورت اور ان کا کوئی مقام نہیں۔

۳- فقہی اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور باب اجتہاد کے وا ہونے سے ڈرا جاتا ہے۔

۴- اگر اجتہاد کی کوششیں کی بھی گئیں تو آزادانہ، یعنی بغیر کسی اصولی طریقہ کار کی پابندی کے۔

ڈاکٹر ترابی کی دعوت کے متعلق آپ جو بھی رائے قائم کریں لیکن اتنا تو طے ہے کہ وہ فقہ پر غور کرنے کے لئے مضبوط ومنضبط طرز فکر تشکیل دینے کی ایک اہم اور قابل قدر کوشش ہے۔

ہونا یہی چاہئے کہ گذرے ہوئے حالات سے گذر جایا جائے اور نئے پیدا ہونے والے حالات کے مطابق ایک جدید لائحہ عمل تیار کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ جو لوگ تجدید کے علمبرداروں پر شک کریں اور ان کو متہم کریں ان کے اس عمل کو ردعمل کی ایک کیفیت سمجھ کر نظر انداز کر دینا بہتر ہے، تجدید ایک مضبوط دھاگا ہے جو عقیدہ اور دین دونوں سے بندھا ہوا ہے۔

و- الٹا اجتہاد:

ڈاکٹر ترابی نے اس اجتہاد کا نام غیر اصولی اجتہاد رکھا ہے، بعض تجدید کے علمبردار اپنی اس دعوت میں اس انتہا کو پہنچے کہ انہوں نے شریعت اور فقہ کو ڈھا ہی دیا، ان کو اصول شریعت میں صرف مصلحت مرسلہ ہی نظر آئی اور اس کو انہوں نے بجا اور بے جا ہر طرح استعمال کرنا چاہا، ان کو اصولیین میں صرف نجم الدین طوفی ہی کی اتباع پسند آئی، جب کہ مصلحت مرسلہ ایک کمزور قسم کی اصولی دلیل ہے، اور طوفی اپنی بہت سی آراء میں منفرد ہیں۔ یہ رجحان کسی طرح بھی تجدید فقہ کی طرف پیش قدمی کرنے والا رجحان نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لئے کہ یہ دعوت تو بنیادی طور پر شریعت اور فقہ کی بیخ کنی اور ان کے انہدام کی دعوت ہے، اور تجدید فقہ کے نام پر ایک الگ آزاد شریعت سازی ہے جس کا اسلام اور شریعت سے بس یہ تعلق ہے کہ وہ بھی اس کو اسلام کا نام دیتے ہیں۔

اسی طرز فکر کے حامل ایک صاحب کہتے ہیں ''ہم بانگ دہل اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ مذاہب فقہاء کا کیا ذکر، خود قرآن وسنت میں عقائد وعبادات کے سوا دنیاوی امور ومعاملات سے متعلق جتنے احکام ہیں وہ ہمارے لئے ہر حال میں لازم نہیں، بلکہ بلا خوف تردید ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں فرض تھیں یا حرام تھیں اگر ہم ان کو مباح اور جائز نہیں کر سکتے تو کم از کم مستحب ومکروہ تو کہہ ہی سکتے ہیں'' (ڈاکٹر محمد نویہی۔ نحو ثورۃ فی الفکر الدینی۔ ص ۱۴۷-۱۴۸، طبع دار الآداب بیروت، ۱۹۸۳ء)۔

ہمارے ان نام نہاد فقہاء کے درمیان اختلاف بالکل بنیادی نوعیت کا ہے، ان کے طرز فکر کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اسلام بس ایک خالی تھیلا، اور ایک کھوکھلا وجود ہے۔ اس میں ہر زمانہ کا انسان اپنی خواہش کے مطابق جو چاہے بھر لے، حیاتِ انسانی میں اسلام کا کوئی موثر رول نہیں ہے، اسلام کا کام صرف جذباتی اور خیالی وعظ ونصیحت ہے۔

یہ رجحان صرف فقہ کی بیخ کنی اور قانون اسلام سے بغاوت ہی نہیں ہے بلکہ یہ کلیۃً دین ہی سے خروج ہے، عقل پرست ''اودینس'' اپنی کتاب ''الثابت والمتحول'' میں کہتا ہے:

''ایک ایسی عقلیت پسند (عقل پرست) تحریک کی ضرورت ہے جو بذات خود وحی کو ہی معرض تنقید بنائے، اس لئے کہ وحی کی ضرورت ہی اس تصور کی وجہ سے پڑی کہ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے ناقص ہے، اس کے اندر اس کی اہلیت نہیں کہ وہ اپنی عقل کے ذریعہ اس کمی کا تدارک کرسکے، اس لئے اس کے کمال کے حصول اور نجات پانے کے لئے کسی مافوق الفطرت ہدایت کی ضرورت ہے، اسی ہدایت کا نام وحی ہے، یعنی انسان کی نجات دہندہ چیز انسان کے اپنے اندر نہیں ہے بلکہ وہ چیز خارج سے آتی ہے۔ اب اس وحی پر تنقید کرنے سے یہ بات ثابت ہوجائے گی کہ انسان اس پر قادر ہے کہ وہ اس کائنات کے نظام کو سمجھ سکے، بلکہ اپنی عقل کی بنیاد پر وہ فطرت پر حاوی ہوجائے اور اپنی مرض کا مالک ومختار ہوجائے، (انسان کی عقل چونکہ مقید ہے اس لئے وہ یہ نہیں کرپارہی ہے ورنہ اس میں اس سب کی اہلیت موجود ہے) اور چونکہ تاریخی، سیاسی اور معاشرتی طور پر انسانی عقل پر وحی کی بیڑیاں پڑی ہیں، اس لئے سب سے پہلا قدم یہی ہونا چاہئے کہ اس کو اس سے آزاد کرایا جائے، اور اس طرز فکر کی سخت مذمت کی جائے جو وحی کی پیداوار ہے''۔

اس طرح اودینس نے بھی اس حد کو جالیا جہاں اس سے پہلے عبد الرحمٰن بدوی اپنی کتاب ''تاریخ الإلحاد فی الإسلام'' میں پہنچا تھا۔ اس رجحان کے حامل افراد کا مقصد اصلاح وتجدید کے نام پر پورے فقہی سرمایہ کو دریا برد کردینا اور ترقی پسندی کے عنوان سے تمام نصوص قطعیہ کو پس پشت ڈال کر ایک نئے قسم کے طبع زاد اسلامی قانون کی ایجاد ہے۔

اس طرح کا رجحان رکھنے والے اسی طرح کی انوکھی اور عجیب وغریب قسم کی ملحدانہ تجاویز رکھتے رہے ہیں۔ ہشام جعیط نے مسلمانوں کی تہذیبی وتمدنی ترقی کے لئے میراث میں

عورتوں اور مردوں کا برابر حصہ دینے کی تجویز رکھی اور اس کی پرزور وکالت کی، حسین جمیل بھی اسی طرح کی ایک تجویز رکھتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ فوجداری کے قوانین میں اسلام کے منقول قوانین کو چھوڑ کر دوسرے نرم قسم کے قوانین اختیار کئے جائیں، اس لئے کہ اسلامی قوانین حقوق انسانی کے اس عالمی منشور کے خلاف ہیں جس پر بین الاقوامی سطح پر اتفاق ہو چکا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک نظریہ اور موقف ہے لیکن اس کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے اور نہ اس میں کسی اصولی طریقہ کار کی پیروی کی گئی ہے۔

۲-اسلامی احکام کی قانون سازی:

اس وقت فقہاء کی اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ اسلامی احکام کی ایک متعین منہج کے مطابق قانون سازی کی جائے، اسلامی فقہ کی ترقی کے لئے یہ ایک مفید خدمت ہوگی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا کہ اسلامی شریعت از سر نو اپنا فیصلہ کن اور حاکمانہ مقام دوبارہ حاصل کرے۔

دشمنان اسلام کی ہمیشہ سے ہی یہ کوشش رہی ہے کہ شریعت اسلام زندگی کے پیہم رواں دواں قافلہ سے پچھڑی رہے، اور اپنا اصل مقام ومنصب حاصل نہ کر سکے۔ انہوں نے شروع ہی سے یہ چاہا کہ فقہ گذشتہ صدیوں کا ایک علمی خزانہ بن کر رہ جائے، اس کی تاریخی طور پر تو کچھ اہمیت ہو لیکن موجودہ زندگی اس سے رہنمائی حاصل کرے اور اس کو فیصلہ کن حاکمانہ مقام دیکر اس حیثیت سے اس کی برتری تسلیم کرے، یہ ان کو کسی طرح منظور نہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں قانون سے انسان کا سابقہ پڑتا رہتا ہے، قانون کے میدان سے اسلامی شریعت کو دور کر کے ان بے بنیاد الزامات کے لئے راہ ہموار کردی گئی کہ اسلامی شریعت میں جمود ہے اور اسلامی قانون زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اجنبی درآمد کردہ قانون نے اپنے مسلسل عمل کے نتیجہ میں سربرآوردہ طبقہ کی غالب اکثریت کا ذہن بالکل غیر اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا ہے اور معاشرہ کے اقدار میں عظیم انقلاب

برپا کردیا ہے، اسلامی قانون کے نافذ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی طبقہ ہے۔

اس صورتِ حال کا شدید تقاضا ہے کہ کامل مغرب پرستی کے منصوبہ کے مقابلہ میں اسلامی احکام کی بالکل جدید طرز کے مطابق قانون سازی کی جائے، اسی سے امت کی موجودہ کمزوریوں کا بھی علاج ہو سکے گا اور موجودہ فقہی بحران کے خاتمہ کا یہ ایک بہتر اور مؤثر طریقہ ہے۔

قانون سازی کا نظریہ اسلامی شریعت کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے، ابن المقفع نے اپنے ''رسالۃ الصحابہ'' میں قانون سازی کی پرزور دعوت پیش کی، خلیفہ ابوجعفر منصور بھی اس کا پرجوش داعی تھا۔ امام مالکؒ نے اس نظریہ کو عملی شکل دے کر مؤطا مرتب کی، لیکن انہوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ ایک ایسے عہد میں جب کہ فقہ واجتہاد اپنی پوری رفتار سے ترقی کی طرف گامزن ہے اور ہر طرف اس کے ماہرین موجود ہیں، وہ فقہ کو ایک تنگ دائرہ میں بند کر کے اس کی وسعت پر روک لگائیں اور مؤطا کو تمام بلادِ اسلامیہ پر لازماً نافذ کرا دیں، چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں ابوجعفر منصور کی تجویز مسترد کر دی، امام مالکؒ کی یہ رائے بڑی بصیرت اور دور اندیشی پر مبنی تھی، اس لئے کہ اگر اس وقت کسی ایک قانون کو لاگو کر کے آزادانہ اجتہاد کے لئے میدان ختم کر دیا جاتا تو آج ہمارے سامنے جو عظیم فقہی سرمایہ موجود ہے اس کا ایک چوتھائی بھی نہ ہوتا، لیکن ابن المقفع کا بھی ایک عملی نقطۂ نظر تھا، ان کی کوشش یہ تھی کہ اجتہادوں کے آپس میں تضاد اور اختلاف کے نتیجہ میں پورے ملک میں جو انتشار اور قانونوں کا تعدد پایا جا رہا ہے اس کو ختم کر دیا جائے۔

یہ صورتِ حال متاخرین فقہاء کے لئے مزید پریشانی کا باعث بنی اور اس کے حل کے لئے انہوں نے مفتی بہ اقوال کو جمع کرنے کا کام انجام دیا، ان مجموعوں نے ایک مثبت رول ادا کیا، اور باوجود اس کے کہ ان کو کسی فقیہ کے لئے لازم نہیں کر دیا گیا تھا پھر بھی وہ بڑی حد تک مفید رہے۔

☆ ماضی میں قانون سازی کی کوششیں:

ماضی میں حکومتوں کی طرف سے بھی قانون سازی کی کوششیں کی گئیں اور بعض افراد اور اسلامی اداروں نے اس سلسلے میں اپنے طور پر بھی کام کیا ہے۔

اس طویل عرصہ میں مختلف رائج سیاسی رجحانات کی بنیاد پر اس قانون سازی کا دائرہ گھٹتا اور بڑھتا رہا اور اس کا بھی اثر پڑا ہے کہ حکومتوں نے کس حد تک اور کن شعبوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کو منظور کیا۔

اس سلسلہ کی پہلی کوشش سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں کی گئی اور اس کام کو سرکردہ علماء کی ایک جماعت نے انجام دیا، ان حضرات نے فقہ حنفی کے مطابق معاملات کا یکساں قانون تیار کیا، اس قانون کی تشکیل میں زمانہ سے ہم آہنگی اور مصالح کو زیادہ ترجیح دی گئی، حتی کہ بعض اوقات انہیں بنیادوں پر غیر راجح قول کو اختیار کیا گیا، ہمارے نزدیک یہ طرز عمل زیادہ واقعیت پسندی پر مبنی اور شریعت کے مزاج کے زیادہ موافق ہے، اسلامی قانون سازی کی یہ پہلی کوشش تھی جو ۱۲۹۳ھ میں ''مجلة الأحكام العدلية'' کی صورت میں ظاہر ہوئی اور اس میں یہی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد عثمانی عہد میں قانون سازی نے مزید ترقی کی اور عائلی قوانین کا مجموعہ ''قانون العائلة العثماني'' کی صورت میں سامنے آیا، اس کے تیار کنندگان نے قانون سازی کی راہ میں مزید ایک اور قدم یہ بڑھایا کہ انہوں نے مذاہب اربعہ سے استفادہ کیا، کامل طور پر مذہب حنفی کی پابندی نہیں کی۔

مصر میں تو اسلامی نقطۂ نظر سے حکومتی سطح پر صرف پرسنل لاء وغیرہ ہی کی قانون سازی ہوئی ہے، اس لئے کہ بدقسمتی سے اسلامی شریعت کا دائرہ کار بس انہیں معاملات تک محدود ہوگیا ہے۔ فرانسیسی قانون نے فوجداری اور شہری قانون کے اکثر حصہ سے اسلامی شریعت کو بے دخل کر دیا ہے، اب کچھ مقدمات مخلوط عدالتوں میں جاتے ہیں۔ کچھ سیکولر عدالتوں میں اور کچھ شرعی

عدالتوں میں، اس صورت حال کی وجہ سے عدلیہ کی یکسانیت اور آزادی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اس کے بعد بھی مخلوط اور سیکولر عدالتیں معمولی چیزوں کا بہانہ بنا کر شرعی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں برابر مداخلت کرتی رہتی ہیں، گویا کہ شرعی عدالتوں کا دائرہ کار انتہائی تنگ کیا جانا کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ ضروری سمجھا گیا کہ ہر جانب ان کا محاصرہ کر لیا جائے۔

قانون سازی کی کوششیں صرف حکومتی سطح تک محدود نہیں رہیں بلکہ شخصی طور پر بھی بعض فقہاء اور قانون دانوں نے بیگراں قدر خدمت انجام دینے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے قانون نپولین کے ایک مترجم قدری باشا کا نام آتا ہے، انہوں نے مکمل اسلامی شہری قانون تیار کیا۔

قدری باشا کی اس خدمت کا کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان کے طریقۂ کار میں ایک بنیادی خامی یہ پائی جاتی ہے کہ انہوں نے اس قانون کو صرف ایک مذہب کی بیڑیوں سے پھر پابجولاں کر دیا اور اس ترقی کی راہ میں اس منزل سے الٹے پیروں پھر واپسی شروع کر دی، جہاں عثمانی سلطنت کے عہد میں ہی فقہی کارواں پہنچ چکا تھا، ہوسکتا ہے کہ اس کا اصل محرک ''مجلّہ الاحکام العدلیہ'' ہو جس میں صرف مذہب حنفی ہی کی پیروی کی گئی تھی، لیکن ایسا ہونا کسی طرح مناسب نہیں تھا، کیونکہ مجلّہ کے بعد ''قانون العائلۃ العثمانی'' میں خود ہی اس طریقۂ کار کو ترک کر دیا گیا، بلکہ خود مصر میں بھی مذاہب اربعہ سے استفادہ کافی پہلے سے زیر غور رہا ہے۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں شرعی عدالتوں کا لائحہ عمل جاری ہوا، اس کی دسویں دفعہ میں اس کی صراحت کی گئی تھی کہ فیصلہ مذہب حنفی کے راجح قول کے مطابق ہی کیا جائے گا، لیکن فساد زماں کی بنیاد پر آلات قتل کے معاملہ میں فیصلہ صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کے قول کے مطابق کیا جائے گا۔

بہر حال اس کے باوجود قدری باشا دہ کی یہ خدمت بہت قابل قدر رہے، اس کے علاوہ بیسویں صدی کے نصف اول میں اس جیسی اور کوئی کوشش نظر نہیں آتی، سوائے ایک اجتماعی کوشش

کے جو بعض علماء ازہر اور قانون دانوں نے ۱۹۴۷ء میں نافذ ہونے والے جدید مصری قانون کے ردعمل کے طور پر کی تھی۔ لیکن اس کا دائرہ کار بس نظریہ عقد کی حد تک تھا۔

تجدید و اصلاح فقہ کی تحریک پر قانون سازی کی اس تحریک کا اچھا اور مثبت اثر پڑا۔ اور ایک زیادہ ترقی یافتہ فقہی طرز فکر سامنے آیا جس سے فقہ اسلامی کے لئے نئے آفاق کھلے اور حالات کا مقابلہ کرنے میں مزید سہولت پیدا ہوئی اس کے علاوہ مذاہب اربعہ کے درمیان علمی تعاون کی فضا تیار ہوئی۔

قانون سازی کی تحریک اور اس سلسلہ میں سامنے آنے والی اصلاحی تجاویز اور منصوبوں نے فقہاء کی ہمتوں کو بلند کیا اور ان کے ارادوں کو مہمیز کیا اور ایک نئی فقہی بیداری کے لئے ماحول بنایا۔ شیخ مراغی کہتے ہیں: '' قانون نکاح کے بل نے علمی، دینی اور سوشل حلقوں میں ایک تحریک پیدا کر دی ہے، علماء نے فقہ کی کتابوں اور قرآن وسنت کی طرف رُخ کیا اور بحث واستنباط میں لگ گئے اور ایک تعلیم یافتہ طبقہ اس کے مصالح ونقصانات کا جائزہ لینے لگا، یہ بیداری وسرگرمی اپنی ذات میں ایک برکت ہے۔ جمود موت کی ایک نشانی ہے اور حرکت ونشاط زندگی کی علامت، ہمارے لئے یہ دینی بحث ومباحثہ اصولی طور پر بڑا فرحت بخش ہے چاہے یہ اس بل کی حمایت میں ہو یا مخالفت میں۔

ہمیں امید ہے کہ اس صورتِ حال کے نتیجہ میں فقہ اسلامی کی تجدید کا کارِ عظیم انجام پائے گا، اور ایک طویل عرصہ تک متن وشرح کے پر پیچ عقدوں میں پھنسے رہنے کے بعد اب فقہی ذہن ومزاج از سر نو سرگرم عمل ہوگا۔ اور جامد تقلید کی ذہنیت کا خاتمہ ہو کر حق کی پیروی کی جائے گی اور مصالح کی رعایت کی جائے گی۔ اور پھر یہ حقیقت برسرِ عام آشکارا ہوگی کہ اسلام لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور کسی طرح علمی اور اخلاقی طور پر یہ جائز نہیں ہے کہ اس شریعت کو جمود وتعطل کا الزام دیا جائے، ہمیں امید ہے کہ اس صورت حال کا نتیجہ بہت بہتر

ہوگا، ہوسکتا ہے ہمارے لئے یہ ممکن ہوجائے کہ ہم نکاح اور سارے شعبوں کے احکام کی قانون سازی کریں اور ان کو معاشرہ پر لاگو کریں، ہمیں امید ہے کہ اس علمی بیداری کا یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ ہم لوگوں کو اسلام اور شریعت سے قریب کرسکیں اور سارے دشمنوں اور بدخواہوں کا سر جھکا دیں گے (بحوث فی التشریع الاسلامی ۱/۱-۲ طبع اول: ۷۴ ۱۹ء)۔

اس تحریک کے نتیجہ میں قانون سازی کے میدان میں بڑا خیر ظاہر ہوا، خاص طور پر حکومت کے نافذ قانون کے اس حصہ پر اس کا کافی اثر پڑا جو مکمل طور پر فرانسیسی قانون کے دائرہ میں تھا، چنانچہ سول لاء میں اسلامی قانون کی کافی اہمیت محسوس کی جانے لگی اور اسلامی شریعت کو بھی سول لاء کا ایک مأخذ قرار دیا گیا، بلکہ کافی تعداد میں شریعت کے نظریات وتصورات کو اختیار بھی کیا گیا، مصری قانون میں اسلامی شریعت کے کئی نظریات اختیار کئے گئے، حق کے استعمال میں دھاندلی، ذمہ داری لینے، حوالہ، دین اور شفعہ وغیرہ کے بارے میں فقہ اسلامی کے نظریات کو اختیار کیا گیا اور اس طرح غیر دینی قانون سازی کا اسلامی شریعت سے ربط وتعلق پیدا ہوا اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلامی شریعت کا اس نقطۂ نظر سے گہرا مطالعہ کیا جائے۔

فقہ اور قانون سازی میں گہرا رشتہ ہے، اس لئے جب قانون سازی کا رشتہ فقہ سے کٹ گیا تو فقہ جمود کا شکار ہوگیا لیکن جب قانون ساز حلقوں میں ایک مأخذ قانون ہونے کی حیثیت سے اسلامی شریعت کی دوبارہ گونج ہوئی تو فقہ کے تقابلی مطالعہ پر تحریر وتصنیف کا سیلاب آگیا۔

بلکہ اسی صورت حال کے مزید زور پکڑنے ہی کے نتیجہ میں عراق، اردن اور کویت کے سول لاء میں اسلامی شریعت کا زیادہ حصہ رکھا گیا، ان ممالک کے قوانین نے فقہ اسلامی کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایک نئی سرگرمی نظر آنے لگی، بہت سے قانون دانوں نے جنہوں نے سول لاء کی تشریح وتعبیر میں اپنی عمر کھپائی تھی، وضعی قوانین اور اسلامی قوانین کے تقابلی مطالعہ کو

اپنی تحقیق وتصنیف کا موضوع بنایا۔ ان حضرات کی یہ تحقیق اور کاوشیں انشاء اللہ رنگ لائیں گی۔ اسلامی ممالک خصوصاً مصر کے لاء کالجز کے طریقہ تدریس اور مجموعی طرز فکر پر ان کا اثر پڑے گا۔ اور ایک ایسا ذہن تیار ہوگا جو اسلامی فقہ پر ایک حاکم اور نافذ قانون کی حیثیت سے نظر ڈالے گا۔ جب کہ اب تک لاء کالجز میں اسلامی قانون کا مطالعہ بس قانون کی تاریخ ارتقاء کے ایک مرحلہ ہی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، جب کہ دوسری جانب شریعت کالجز میں خصوصاً جامعہ ازہر میں تبدیلی نصاب ونظام کے بعد جدید علوم قانون کے لئے دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے ہیں اور اسلامی شریعت کی تعلیم کو نقصان پہنچا کر جدید قوانین کی تعلیم کے لئے گنجائش پیدا کی گئی ہے۔

☆ قانون سازی کا طریقہ کار:

قانون سازی کی اس تحریک اور اسلامی قانون کی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کا ایک قابل ذکر نتیجہ یہ ہوا کہ فقہاء کی رایوں سے استفادہ کی نوعیت کے متعلق ایک نیا، زیادہ لچکدار اور مفید ووسیع انداز اختیار کیا جانے لگا، اس طرز فکر کی بنیاد دو چیزوں پر تھی:

۱- سارے مذاہب ومسالک (بشمول مذاہب اربعہ ودیگر مذاہب) کو ایک اکائی تصور کیا گیا اور قانون سازی کے سرچشمہ کے طور پر ان کو مساوی حیثیت دی گئی۔

۲- تلفیق بین المذاہب۔

مذکورہ طرز عمل پر ہی کاربند رہتے ہوئے ہی مصر کا قانون نکاح وطلاق (۲۵) ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کے قوانین تیار کئے گئے، لیکن فقہاء کے حلقوں کی طرف سے اس کی مخالفت وموافقت دونوں موقف سامنے آئے، لیکن مخالفت کی بنیاد پر شرعی قانون سازی کی پالیسی تبدیل نہیں کی گئی، وقف کا نیا قانون جاری کرنے کے بارے میں فقہاء کے درمیان تیز بحثیں ہوئیں، اس نئے قانون وقف کے تیار اور جاری ہونے میں چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ لگ گیا۔

اس مخالفت سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہاء کی جماعت کو قانون سازی کے عمل سے کیا

خطرات اور اس کے پیچھے کیا خدشات نظر آتے ہیں، اور اس کی مذکورہ پالیسی اور منہج کے متعلق ان کے ذہن میں کیا شکوک وشبہات ہیں؟

شیخ عبداللطیف سبکی نے اس قانون پر تنقید کی اور اس کے متعلق اپنا عدم اطمینان ظاہر کیا اور اس کے بعد بنیادی نظریات ومبادی کو ہی نا قابل قبول قرار دیا، ان کے بقول اس قانون میں باہمی ربط اور ہم آہنگی کی کمی تھی، انہوں نے تلفیق بین المذاہب پر بھی سخت تنقید کی اور اس کو اجماع کے خلاف ایک نئی بدعت قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس میں احکام کے اختیار کی اصل بنیاد اور وجہ ترجیح سہولت پسندی ہوا کرتی ہے۔

اور پھر جب یہ قانون قانون ساز کونسل کے سامنے پیش کیا گیا تو شیخ علی عبد الرزاق نے اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے الزام لگایا کہ اس میں نت نئی شرطیں لگائی گئی ہیں، جن کے فقہاء قائل نہیں ہیں، تلفیق کے متعلق بھی ان کی رائے عدم موافقت ہی کی تھی۔ اس کو انہوں نے عاجز کی حیلہ سازی اور فقہ کے ساتھ ایک کھلواڑ قرار دیا، ان کی تقریر کے اختتامی الفاظ یہ تھے:

''آپ لوگ اس قانون کے ذریعہ ایک نئی بدعت شروع کرنا چاہتے ہیں، اندیشہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کے بڑے خطرناک اور دوررس نتائج برآمد ہوں گے، مجھے خدشہ ہے کہ اس کا پہلا پھل تو یہ نکلے گا کہ جو فقہ اسلامی ممالک میں ایک قومی رابطہ اور مضبوط رشتہ کا کام انجام دیتی تھی وہ تتر بتر ہوجائے گی، اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے، اس سے امت کی صفوں میں دراڑیں پڑجائیں گی، آپ اس قانون کے ذریعہ شریعت کو ہر کھلواڑ کرنے والے کے لئے مشق اور ہر بدنیت کے لئے مذاق بنادیں گے''۔

شیخ علی عبدالرزاق کے ان اشکالات کا قانون ساز کمیٹی کے ایک سرگرم رکن شیخ فرج سنہوری نے جواب دیا، انہوں نے اپنی کتاب "موسوعة القوانین المختارة من التشریع الإسلامی" میں ان بحثوں کو ریکارڈ کردیا، انہوں نے کہا: ''اس بل کے مرتبین کا فقہی مقام

ومرتبہ محتاج بیان نہیں، یہ لوگ اسلامی فقہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، شریعت کے مصالح اور احکام کے رموز واسرار سے پوری طرح واقف ہیں، پھر احتیاطاً انہوں نے انفرادی غور وفکر پر اعتماد نہیں کیا بلکہ جمع ہوکر ایک فقہی اکیڈمی کی شکل میں اجتماعی طور پر غور وفکر کر کے اپنے نتیجہ فکر و بحث کو پیش کیا ہے، یہ لوگ اگر اپنے لئے اجتہاد کا دعوی کر دیتے تو کسی کے لئے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔لیکن انہوں نے بس فقہاء کی رایوں سے ہی خوشہ چینی کی اور کسی نئے اجتہاد کا اعلان نہیں کیا، فقہاء کے یہ اقوال کتابوں میں موجود ہیں، مسلمان ان پر اعتبار کرتے آئیں ہیں اور وہ نسل درنسل نقل کئے جاتے رہے ہیں۔

ہاں انہوں نے جب اپنے وسیع علم اور تقاضہائے زمانہ کے مدنظر اختیار وانتخاب کا کام شروع کیا تو کسی متعین مذہب کی پابندی نہیں کی، بلکہ مذاہب اربعہ کے حدود سے بھی بعض جگہ خروج کیا، انہوں نے ان اقوال کا انتخاب کیا جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ ضرورت وحاجت کا تقاضہ ہیں اور جن کو انہوں نے امت کی سماجی ترقی کے لئے ضروری سمجھا۔

اگر آپ اس بل کو مختلف فقہاء کے اقوال وآراء کا مرقع پائیں تو اس میں تعجب وحیرت کی کیابات؟ کس بنیاد پر اس سے اس درجہ احتراز وتنفر؟

اس میں کوئی حکم اسلامی فقہ کے لئے نیا نہیں ہے، ہر حکم یا مسلمانوں کے کسی مسلم الثبوت امام کا قول ہے، یا کسی معتبر فقیہ کی رائے، یا کئی فقہاء کی رایوں کا مجموعہ ہے۔

اس قانون کی یہی بنیاد ہے، ہمارے نزدیک یہ اساس پختہ اور اس قابل ہے کہ اس پر ایک عظیم الشان قانون کی بنا رکھی جائے، یہ صحیح سمت میں جانے والا ایک سیدھا راستہ ہے جس سے منزل تک رسائی ہوسکتی ہے، سلف امت اس راستہ پر چلتے رہے ہیں اور زمانہ نبوت ہی سے اس طریقہ کی اتباع کی گئی ہے، ائمہ مذاہب بھی تو صحابہ وتابعین کے مختلف اقوال کا انتخاب کرتے تھے، اسی طرح اس طریقہ کا رکوان کے بعد کے لوگوں نے جاری رکھا اور اہل تخریج وترجیح بھی اس

پر کار بند رہے، پھر یہ بات بھی ذہن میں تازہ رہنی چاہئے کہ شریعت مطہرہ لوگوں کے مصالح ہی کے لئے اتاری گئی ہے اور اس طریقۂ کار کے ذریعہ اس نکتہ کی زیادہ رعایت کی جاسکتی ہے۔

اس طرح کے مباحثوں سے فقہ اور قانون سازی کا گہرا ربط و تعلق نمایاں ہوا اور اجتہاد کے سلسلہ میں فقہی ذہن کھل کر سامنے آیا۔ فقہاء نے اجتہاد کی ضرورت کو محسوس تو ضرور کیا اور اس کی حمایت بھی کی، لیکن عملی تقلید کے وقت انہوں نے روایتی و موروثی فقہی سرمایہ کی اتباع نہ جانے کیوں لازم سمجھی اور راجح و مرجوح کو ان کے یہاں مساوی حیثیت دی گئی، ہونا تو یہ چاہئے کہ اس فقہی سرمایہ سے ان کے ذہنوں میں اجتہاد کا داعیہ پیدا ہوتا، تاکہ ایسے سریع الانقلاب اور تغیر پذیر حالات کا مقابلہ کیا جاسکے جس کا کوئی واسطہ قدیم فقہ کو نہیں پڑا تھا۔ قدیم سرمایہ کو بغیر اس کی جدید نظر یہ سازی اور اس کے مطابق آزادی اجتہاد کے نئے زمانہ پر مسلط کردینا جہاں سخت حرج اور ضیق کا باعث ہے وہیں دور حاضر کے فقہاء پر پسماندگی اور جمود کی تہمت عائد ہوگی بلکہ ''معکوس اجتہاد'' کے علمبرداروں کے لئے میدان خالی ہوجائے گا۔ میرا مقصد ''تلفیق و اختیار'' کے طرز کی تائید نہیں، ضرورت ایسے منہج کی ہے جس میں اچھے طریقے سے نصوص اور واقعات وحالات کا رشتہ استوار رکھا گیا ہو۔

لیکن پھر بھی اس نئے طرز فکر نے ایک ایسا ذہنی وفکری ماحول بنایا جس کے تناظر میں فقہی بحران سے گلوخلاصی ممکن نظر آتی تھی، فقہی تحریک پر اس کے گہرے اور وسیع اثرات پڑے۔

اس کا ایک خوش کن اور امید افزا اثر یہ بھی ہوا کہ مسلکی عصبیت ختم ہوئی اور وسیع کشادہ ذہنیت پیدا ہوئی، ممتاز فقہاء کی طرف سے اسلام کے مختلف مذاہب کے درمیان قربت وتعاون کی دعوت شروع ہوئی تاکہ فقہ اسلامی کو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش سے الگ کیا جاسکے، اور ایک طاقتور شرعی وفقہی محاذ تشکیل پائے جو اسلامی فقہ کے مخالفین کے حملوں کا دفاع کرے۔

منہجی بحران کے باوجود فقہی ذہنیت میں واقعیت پسندی کا رجحان غالب ہے، دور حاضر کے فقہاء کی کوشش ہے کہ فقہ اور شریعت کا رشتہ حیات انسانی سے دوبارہ استوار کردیں،

ساتھ ہی ان حضرات کو موجودہ بحران کا پورا اندازہ ہے اور فقہ اسلامی کو جو معرکہ درپیش ہے اس کے دائرہ نتائج واثرات کا پورا ادراک ہے، یہ سنگین غلطی ہوگی کہ موجودہ فقہی ذہن تدریجاً خالص نظریاتی بحثوں میں الجھ جائے ،فقہ اسلامی کو حالات وواقعات سے مربوط کرنا ضروری ہے ،قانون سازی سے فقہ اسلامی کا رشتہ کٹنے کے بعد فقہ خالص دماغی عمل ہوکر رہ جائے گا اور بانجھ پن کا شکار ہوجائے گا، ہماری عقلی تاریخ میں فقہ اسلامی کا نمو اور ترقی قانون سازی کے جلو میں ہوئی ہے اور قانون سازی اسی وقت ہماری اسلامی زندگی سے ہم آہنگ اور ہمارے لائق ہوسکتی ہے جب کہ اس کا عمومی فلسفہ اور بنیادی نظام کتاب وسنت پر مبنی ترقی یافتہ فقہ اسلامی سے ماخوذ ہے۔

ان چند صفحات کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ دور میں فقہ کے مسائل کا جائزہ لیا جائے اور آئندہ کیا امیدیں ہیں؟ کیا کوششیں درکار ہیں؟ اور کیا طریقہ کار مفید ہوسکتا ہے؟ اس کا پتہ لگایا جائے ،تاکہ ہم ایک ذہنی کشمکش سے نکل کر نئی راہ پر آسکیں۔

لعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک أمراً

☆☆☆